© rasailojaraid.com

تم آئے بزم میں اتنا تو میں نے دیکھا پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

سلوک و تصوف استاذ الملک نے پوری زندگی گو علماء کے انداز پر گذاری لیکن قدرت نے انھیں صوفی صافی بھی بنایا تھا اس لئے عمر کے ساتھ ساتھ تصوف کی طرف میلان بڑھتا گیا۔ بالآخر شیخ عبدالقدوس قلندر جونپوری کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے شیخ عبدالقدوس قلندر زہد و تقویٰ اور عشق الٰہی میں خاص امتیاز رکھتے تھے استغناء اور ماسوا اللہ سے بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھتے تھے جنگلات سے گھاس کاٹتے اور فروخت کر کے بسر اوقات کرتے تھے کھانے میں مشتبہات سے انتہائی اجتناب کرتے اور اکل حلال کا بڑا اہتمام تھا آپ کی ذات مرجع خلائق تھی خواص و عوام سب آپ کی صحبت کو سرمایۂ سعادت سمجھتے تھے اپنے وقت کے مشاہیر علماء نے آپ سے کسب فیض کیا آپ کی ولادت ۹۴۳ھ میں جونپور میں ہوئی آپ کے والد شیخ قیام الدین قطب الدین بینائے دل سے خلافت ملی تھی۔

اپنے مسترشدین کے شوق و طلب کا نہایت سخت امتحان لیتے تھے گنج ارشدی میں ہے کہ جب دیوان محمد رشید بیعت کے لئے حاضر ہوئے تو ان سے بات تک نہ کی تقریباً ایک سال تک برابر دیوان صاحب حاضر خدمت ہوتے رہے مگر رعب کی وجہ سے عرض مدعا کی جرأت نہ ہوئی ایک سال کے بعد ایک دن قلندر صاحب نے فرمایا کہ نصف شب کے بعد آنا خانقاہ دریا کے پار تھی اور نصف شب کے بعد پل کا دروازہ بھی بند ہو جاتا تھا۔ مگر دیوان صاحب دریا پار کر کے حکم کے مطابق پہونچ گئے اس وقت قلندر صاحب نے بیعت کی۔

ایک سو دس برس کی عمر میں ۱۲ ارشوال ۱۰۵۲ھ کو وفات پائی آپ کا مزار جیل خانہ کے جنوب میں سڑک اور جیل کی چہار دیواری کے درمیان واقع ہے[1]۔

---

[1] گنج ارشدی و تجلی نور ص ۶۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استاذ الملک نے جونپور کے قیام کے زمانہ میں بیعت کی اور تعلیم وتدریس کے ساتھ مجاہدہ وریاضت کا بھی سلسلہ جاری رہا اور مختصر مدت میں تصوف کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے اور قطبیت کے عہدہ سے سرفراز ہوئے۔

گنج ارشد میں ہے مرتب احقر از پیر دستگیر خود شنیدہ فرمود کہ روز وفات استاذ العلماء حضرت بندگی شیخ محمد افضل قدس سرہ در لاہور ہماں روز ملا خواجہ قدس سرہ فرمود امروز قطب جونپور وفات یافت[۱]۔ ملا خواجہ سلسلۂ قادریہ کے مشہور مشائخ میں ہیں۔

صاحب تجلی نور لکھتے ہیں:۔

"قطع نظر علوم ظاہر اہل دل صوفی صافی روشن ضمیر آغاز وانجام حقیقت را بمیزان اعتبار ہم سنجیدہ بود بیعت از شیخ عبدالقدس قلندر جونپوری داشت در کرامت وخوارق بغایت ستر نمودی[۲]۔"

آزاد بلگرامی مرحوم نے لکھا ہے۔

انہ کان حصوراً تقیاً حسن الخلق سلیم المزاج[۳] — استاذ الملک پاک نفس متقی خوش خلق اور سلیم الطبع تھے

تصانیف استاذ الملک تمام علوم متداولہ وفنون متعارفہ میں امامت وعبقریت کا درجہ رکھتے تھے مگر ان کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں ملتا معلوم ہوتا ہے کہ حلقۂ درس کی وسعت اور مشغولیت سے تصنیف وتالیف کا موقع نہ مل سکا۔

شاعری استاذ الملک بہت عمدہ شاعر تھے اس فن پر آپ کو کافی عبور تھا مگر طبعاً شعر گوئی کی طرف میلان کم تھا کبھی کبھی تفنناً فارسی میں شعر کہتے تھے۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

با زلف تو تورہ عنبر چہ کنم	با خال تو مشکناۓ اذخر چہ کنم
تو کافر و زلف کافر و دل کافر	من نیم مسلمان بسہ کافر چہ کنم[۴]

۱؎ گنج ارشدی ورق ۲۳ ۲؎ تجلی نور ص ۴۵ ۳؎ سبحۃ المرجان ص ۱۰ ۴؎ تجلی نور ص ۴۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وفات آپ کے شاگرد رشید فخر استاذ ملا محمود جونپوری کا اسہتر سال کی عمر میں استاذ الملک کے سامنے انتقال ہوگیا استاذ الملک اس صدمۂ جانکاہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ چالیس دن تک آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں دیکھی گئی اور اکتالیسویں دن اس غم کو سینے سے لگائے ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ کو بعمر چوراسی سال سات ماہ تلمیذ عزیز سے جا ملے استاذ و شاگرد کے تعلق کی یہ ایسی مثال ہے جس کی نظیر شاذ و نادر ہی ملے گی[۱]

مزار محلہ سپاہ شہر جونپور میں ریلوے لائن سے مشرق جانب ایک چبوترے پر واقع ہے مقالہ نگار کو کئی بار حاضری کا موقع ملا ہے۔

بعض تذکرہ نویسوں نے تاریخ وفات ۱۹ کے بجائے ۱۳ ربیع الثانی بیان کی ہے"

ز محمود و افضل بگو آہ آہ سے استاذ و شاگرد دونوں کا سنہ وفات نکلتا ہے۔

استاذ الملک کے مزاج میں اس درجہ تواضع و انکسار تھا کہ کسی سے خدمت لینا قطعاً پسند نہیں کرتے تھے اپنا کل کام خود ہی انجام دیتے تھے دیوان محمد رشید نقل کرتے ہیں کہ حضرت بندگی میاں محمد افضل ہمہ کارہا خود می کردند حتیٰ کہ چراغ حجرہ خود روشن کردند و کتاب از حجرہ خود می آوردند[۱]

جونپور کے وقائع نگار نے آپ کے علم و فضل کے بارے میں جہانگیر کو اطلاع دی اس نے ان کو استاذ الملک کا لقب اور جونپور کے شاہی مدرسہ کی مدرسی اور جاگیر کا پروانہ روانہ کیا مگر ملا محمد افضل نے اس کے قبول کرنے سے معذرت کر دی اور پوری زندگی توکل و تدریس میں گذار دی[۲]

امرا و حکام کے دربار میں حاضری سے بہت اجتناب کرتے تھے کبھی اپنی غرض لے کر ان کے پاس نہیں گئے اگرچہ حکام آپ کی خدمت باعث سعادت سمجھتے تھے۔

تجلی نور میں ہے۔

---

۱ گنج ارشدی ورق ۱۳۶ ۲ معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۳۰ء ۳ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

با وصف چندیں با استدعا و طلب بر در امرا و ملوک نمی رفتی مگر برائے حوائج فقرا و طلبا ہیچو مردم بخانہ چشم منتظراں در آمدی ۔ تجلی نور ص۳۵

اولاد و تلامیذ استاذ الملک کی کسی اولاد کا ان کے تذکرہ نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے البتہ ان کے شاگردوں کی فہرست بڑی طویل ہے تاریخوں میں منتشر طور پر کچھ لوگوں کا پتہ چلتا ہے جن میں مشاہیر درج ذیل ہیں لیکن ان کی تعیین بھی مشکل ہے۔

ملا محمود بن محمد جونپوری آپ دلیدپور[1] ضلع جونپور کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۹۹۳ھ میں پیدا ہوئے تعلیم وتحصیل کی تکمیل استاذ الملک کے زیر نگرانی کی بڑے ذہین، فطین اور علم کے بیحد شائق تھے تعلیم کے زمانہ میں بڑی محنت و جانفشانی کی اور بہت جلد اپنے پیشروؤں سے بھی آگے نکل گئے آپ کے طلب و اشتیاق کی قدر استاد الملک بھی کرتے تھے آپ فخر استاذ تھے استاذ الملک کے تمام تلامذہ میں آپ کا اور دیوان محمد رشید کا علمی درجہ بہت اونچا تھا اور بعض علوم میں آپ کو دیوان محمد رشید پر بھی فوقیت حاصل تھی۔ صرف سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی بالخصوص فلسفہ میں ایسا کمال پیدا کر لیا کہ متقدمین میں بھی ان کے ہم پایہ کم نظر آتے ہیں متعدد اہم کتابوں کے مصنف ہیں ان میں شمس بازغہ اور فرائد محمودیہ بہت مشہور اور اپنے فن میں نہایت جامع ہیں ایک عرصہ تک یہ دونوں کتابیں داخل نصاب رہ چکی ہیں شمس بازغہ پر متعدد علماء نے حواشی و شروح لکھے۔ شعر و سخن میں بھی ید طولی رکھتے تھے دو دیوان یادگار چھوڑے۔

نمونہ شعر پیش ہیں۔

برصوفی بے وجد و بال است عبادت　　برشیشہ کہ خالیست زمے سجدہ حرام است

اشکے کہ راز عشق بگوید فشاندنی است　　طفلے کہ خوش محاورہ افتد نماندنی است

---

[1] اب دلیدپور ضلع اعظم گڑھ میں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملا محمود نے اپنے استاذ کی طرح پوری عمر درس و تدریس میں گذاردی آپ کے مشہور شاگردوں میں ملا عبدالباقی جونپوری خاص شہرت کے مالک ہیں جنہوں نے دیوان صاحب کی مناظرہ رشیدیہ پر استدراک لکھے ہیں۔

ملا محمود کا سنہ ۱۰۶۳ھ میں انتقال ہوا مزار چاچک پور شہر جونپور میں ہے۔[1]

دیوان محمد رشید جونپوری بھی استاذ الملک کے ارشد تلامذہ میں ہیں استاذ الملک سے انھیں خاص لگاؤ تھا تکمیل کے بعد بھی ہفتہ میں ایک بار ضرور حاضری دیتے تھے جب تک استاذ الملک نے درس و تدریس کا حکم نہیں دیا اس کا سلسلہ شروع نہیں کیا لوگوں کے اصرار پر فرما دیتے کہ جس جگہ استاذ الملک جیسی ہمہ گیر شخصیت مصروف تدریس ہو مجھ جیسے شخص کے لئے تدریس کی مسند پر بیٹھنا مناسب نہیں۔

دیوان صاحب جملہ علوم میں مہارت رکھتے تھے تعلیم و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی شغل تھا اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں القویم فی احادیث النبی الکریم، مناظرہ رشیدیہ اور شرح اسرار الحکمت نہایت جامع اور اہم ہیں رشیدیہ تو اب تک نصاب میں داخل ہے۔ علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی آپ کا مقام نہایت بلند ہے اس دور میں تصوف کے جتنے سلاسل ہندوستان میں تھے ان سب میں آپ کو خلافت و اجازت حاصل تھی اس وصف میں دیوان صاحب اپنے تمام معاصرین میں ممتاز اور فائق ہیں۔

شاعری میں بھی آپ خاص اہمیت کے مالک تھے شمسی تخلص تھا دیوان شمسی کے نام سے آپ کا قلمی دیوان کتب خانہ خانقاہ رشیدیہ جونپور میں اب بھی موجود ہے۔

نمونہ کلام پیش ہے۔

بر بدن صد زخم خنجر گر زنی — کے بمیرم جان بجائے دیگر است
من بہ یکدم سیر عالم می کنم — روح را دستے و پائے دیگر است

---

[1] تجلی نور ص ۹۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گردش و گرد کہ تا گرد دینہ گردی در راہ — کے بدانی کہ دریں راہ سوارے باشد

اپنے والد کے جائے مدفن کے بارے میں کیا عمدہ شعر کہا ہے۔

چوں یار بہ بنگالہ شود مسکن و ماوٰی — شمسی بہ بدخشاں نرود لعل بہ بنگ است

۱۰ ذیقعدہ ۸۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۹ رمضان ۸۴۳ھ کو وفات پائی مزار محلہ رشید آباد شہر جونپور میں ہے۔

دیوان صاحب کے مفصل حالات کے لئے راقم کا مقالہ دیوان محمد رشید مطبوعہ معارف۔ اعظم گڑھ جون و جولائی ۱۹۷۲ء ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) ملا ضیاء الدین جونپوری استاذ الملک کے مشہور شاگرد ہیں جملہ علوم و فنون میں تبحر حاصل تھا۔ حدیث، فقہ اور لغت میں امتیازی شان رکھتے تھے ایک ہزار سے زائد احادیث کے حافظ تھے قاموس مولفہ مجد الدین فیروزآبادی بھی نوک زبان تھی۔ نہایت متقی، اور پرہیزگار تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے شہزادہ بہادر شاہ کی تعلیم و تربیت ان کو مامور کیا تھا عین عالم شباب میں وفات پائی۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے [1]

(۴) سلطان محمود عثمانی — آپ سلطان الملک کے برادر حقیقی ہیں ولادت قصبہ ردولی میں ہوئی تعلیم و تربیت استاذ الملک کی نگرانی میں پائی۔ استاذ الملک کے ہمراہ یہ بھی جونپور چلے آئے تھے اور جونپور ہی میں شیخ مبارک بن خیر محمد جونپوری کی صاحبزادی سے عقد ہوا۔

سلطان محمود اپنے وقت کے مشاہیر صوفیا میں ہیں اپنے خسر شیخ مبارک سے بیعت کی اور بہت جلد جملہ مقامات کو طے کر کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ گئے۔

آپ نے میر علی بن قوام الدین سرائے میری المعروف بہ علی عاشقاں سے بھی کسب فیض کیا تھا اپنے زمانہ میں مرجع خاص و عام تھے اور بیشمار کرامات آپ سے ظاہر ہوئیں

---

[1] گنج ارشدی قلمی و گنج رشیدی قلمی۔ [2] معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۳۰ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تجلی نور میں ہے طبیعت فقر آشنا بود و از خسر خود حضرت مبارک خیر محمد بیعت نمود و در ریاضت باطنی بر خود کشیدہ باندک زمانہ طے منازل کردہ منازل سلوک و خضر جادہ مستقیم گشت و از میر علی عاشقان سرائے میری[1] ہم فیض فراواں برگرفت بسیار مردم بر دگر وید ند و بسیار خوارق از و بر گذارند[2]۔ سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا مزار محلہ چاچک پور شہر جونپور میں ہے۔

محمد ارشد بن محمد رشید جونپوری انھیں بھی استاذ الملک سے تلمذ کا شرف حاصل تھا استاذ الملک ان سے بہت محبت کرتے تھے ان کا پہلا نکاح استاذ الملک ہی کی تجویز پر ہوا تھا۔ ولادت ۱۰۴۲ھ میں ہوئی بیس سال کی عمر میں علوم ظاہری و باطنی دونوں[3] میں کمال حاصل کر لیا تھا آپ کا مشغلہ بھی تعلیم و تدریس ہی تھا اور اس میں بڑا انہماک تھا۔ صبح کو درسگاہ میں بیٹھتے تو دوپہر کے وقت اٹھتے اور ظہر کی نماز اول وقت جماعت سے پڑھ کر پھر درس شروع کر دیتے۔ طلبا سے بڑی محبت رکھتے تھے جو خود کھاتے انھیں کھلاتے نہایت متقی پرہیزگار اور متبع سنت تھے اگر کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تو بڑی بشاشت و انبساط کا اظہار فرماتے اور کہتے کہ سنت نبوی پر عمل کی توفیق ہوئی۔

خاندان رشیدی میں دیوان صاحب کے بعد اس درجہ و مقام کا کوئی شخص دوسرا نظر نہیں آتا سہ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۱۳ھ کو کلمہ لا الٰہ کا ورد کرتے ہوئے واصل بحق ہوئے آپ کا مزار بھی رشید آباد شہر جونپور میں ہے[4]۔

(۶) **شیخ مولا چاندن** جملہ علوم و فنون کی تعلیم استاذ الملک سے حاصل کی اس دور کے مشاہیر علمائے محدثین میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

علم حدیث میں بہت شغف رکھتے تھے حرمین شریفین تشریف لے گئے تو وہاں کے محدثین سے بھی حدیث کی تصحیح اور اسکی سند حاصل کی اور اسی سفر میں ۱۰۶۲ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہ ہو سکی[5]۔

---

(۱) سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں مشہور قصبہ ہے۔ قصبہ سے متصل پچھم سمت علی عاشقان کا مزار آج بھی موجود ہے (۲) تجلی نور ص ۷۷، (۳) گنج ارشدی قلمی ورق ۱۰۱ (۴) معارف مئی ۱۹۳۰ء و تجلی نور۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرزا غالبؔ کی فارسی دانی

پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین ایس۔ گوریکر ایم۔ اے۔ پی، ایچ، ڈی
صدر شعبۂ فارسی و اردو سینٹ زیویئرس کالج بمبئی ۱

انیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار زمانہ ہے جب ہمارا ملک ایک زبردست انقلاب سے دوچار ہوا۔ یہ انقلاب نہ صرف سیاسی بلکہ ایک حد تک لسانیاتی بھی تھا۔ آشوبِ وقت نے طبیعتیں آشفتہ کر دی تھیں۔ فارسی کا چراغ آخر مرحلہ پر پہنچ کر اس انتظار میں تھا کہ اس کا شعلۂ آخری اس طرح بھرپور جست لگا کر ختم ہو جائے جس طرح کسی طوفان کے آنے سے پہلے ایک سکون پیدا ہو جاتا ہے اور ایک خلاء محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس صدی کے آغاز میں اگرچہ ہر طرف فارسی زبان و ادب کا بول بالا تھا، دربار و دفاتر میں اسی زبان کا سکہ چلتا تھا اور شعراء و ادباء کی محفلوں میں اسی زبان کے چرچے تھے مگر فارسی کے ماحول میں بالکل وہی کیفیت تھی، کہیں کہیں سرسراہٹ ہوتی مگر رقیب زبان کے نغموں میں ڈوب جاتی۔ دوسرے لفظوں میں زبان اردو کا طنطنہ بلند ہو رہا تھا اور ان دنوں جن اصحابِ ذوق نے طبع آزمائی کی انھوں نے اردو کو مقدم سمجھا اور فارسی کو ثانوی بلکہ تفریحی گردانا۔ اس اعتبار سے فارسی اساتذہ اور شعراء نے اس لسانی اور ادبی انقلاب میں مدد دی۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے آخری ایام میں شاہ سعد اللہ گلشنؔ نے اپنے شاگرد رشید ولیؔ کو مشورہ دیا کہ وہ اردو زبان میں فارسی شعرا کے طرز پر لکھیں: "این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ جو ابتداءً میں اسدؔ تخلص کرتے تھے اس وقت منصۂ شہود پر آئے جب مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی اور حکومت برطانیہ اپنا اقتدار جما رہی تھی۔ مشرقی تمدن اور بالخصوص مغلیہ ثقافت اپنی چار صد سالہ تابانی کے بعد ماند پڑ چکی تھی اور مغربی تہذیب برسرِ پیکار تھی۔ بالفاظِ دیگر غالبؔ کا عہد ایک سیاسی دو عملی کا عہد تھا' ایک انقلاب کا زمانہ تھا' ایک عبوری عصر تھا۔ غالبؔ نے ایک تمدن کو اجڑتے اور دوسرے کو ابھرتے دیکھا ہے اگرچہ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے تصادم سے قدریں بدلیں اور ایک ذہنی کشمکش پیدا ہوئی تاہم غالبؔ نے حقائقِ زندگی کو نگاہ سے اوجھل ہونے نہیں دیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ہنگامی دوائر میں نہ گھٹا بلکہ دوامی کیفیت پا گیا۔ غالبؔ دنیا کے ان مشاہیر فن کاروں میں سے ایک ہیں جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کی ذات میں بیک وقت نہ صرف کئی صفات کا اجتماع نظر آتا ہے بلکہ جن کی ہر صفت ایک امتیازی شان کا مظہر ہوتی ہے بقول غالبؔ ؎

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ — چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

غالب ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق دسمبر ۱۷۹۷ء بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ اپنی ولادت کے بارے میں ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

غالبؔ چو ز نا سازیِ فرجام نصیب — ہم بیم عدو دارم و ہم ذوقِ حبیب
تاریخِ ولادتِ من از عالمِ قدس — ہم 'شورشِ شوق' (۱۲۱۲ھ) و ہم لفظ 'غریب' (۱۲۱۲ھ)

اور ۱۲۸۵ھ ہجری مطابق ۱۸۶۹ء عیسوی میں انتقال کیا اگرچہ مرنے سے بیس سال پہلے تاریخ وفات کا مادہ ہاتھ آیا جو انھیں بہت پسند آیا اور جس کو انھوں نے اس طرح موزوں کیا تھا ؎

من کہ باشم کہ جاوداں باشم — چوں نظیریؔ نماند و طالبؔ مرد
در بپرسند در کدامیں سال — مرد غالبؔ بگو کہ 'غالب مرد' (۱۲۷۷ھ)

غالب تورانی النسل تھے۔ ان کے آباو اجداد ترک قوم کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے سمرقند میں کاشتکاری و سپاہ گری کیا کرتے تھے اور اپنا سلسلۂ نسب افراسیاب سے ملاتے تھے۔

غالب از خاک پاک تورانیم　　لاجرم در نسب افراسیابیم
ترک نژادیم و در نژاد ہمی　　بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک　　در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبادی من کشاورزیست　　مرزبان زادۂ سمرقندیم

آقامی بزرگ شیرازی وفا کو اپنے ایک مکتوب میں اپنے نسب کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں

گرفتم کہ از تخم افراسیابم　　گرفتم کہ از نسل سلجوقیانم

اسی طرح سراج احمد کو بھی لکھتے ہیں: "ترک نژاد و نسب من بہ افراسیاب و پشنگ می پیوندد و بزرگان از آنجا کہ با سلجوقیان پیوند ہم گوہری داشتند۔"

اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تدریس کے سلسلے میں غالب یوں کہتے ہیں: "میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ اس کے بعد لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور، عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔

اگرچہ غالب شروع سے انگریزوں کے وظیفہ خوار اور انگریزی عملداری کے تابع زندگی بسر کرتے تھے تاہم ان میں ایرانی ثقافت، تہذیب اور بوئے ریاست کی کشش اب بھی باقی تھی۔

دیدہ ور سلطان سراج الدین بہادر شاہ ظفر　　آں شرر بیند کہ پنہاں در رگِ سنگِ من است

اسی دیدہ وری کے صدقہ میں جولائی ۱۸۵۰ء عیسوی میں شاہی ملازمت مل گئی اور مشاہرہ پچاس روپیہ ماہانہ مقرر ہوا جو اپریل ۱۸۵۷ء عیسوی تک ملتا رہا۔ خدمت یہ سپرد ہوئی کہ شاہی طبیب خاص حکیم احسن اللہ خاں تاریخی واقعات کا انتخاب کریں اور وہ (غالب) ان کو الفاظ کا جامہ پہنادیں۔ دوسرے لفظوں میں حکیم موصوف کی زیر نگرانی غالب نے ۱۸۵۲ء عیسوی میں پہلا حصہ مہر نیم روز کے نام سے لکھ کر باریاب ہوئے اور تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے اور مہر نیم روز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دیباچہ کے مطابق بہادر شاہ ظفر نے "غالب سخن سرائی رانجم الدولہ دبیر الملک بہادر نظام جنگ خواندہ"

اپنے استاد خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کی ۱۲۷۱ھ ہجری میں وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر نے غالب کو اپنے اشعار کی اصلاح کی خدمت پر مامور کیا۔ اس سلسلہ میں والی رام پور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں" پیوند تعلق با بہادر شاہ جز آں نبود کہ از ہفت ہشت سال بہ تحریر تاریخ سلاطین تیموریہ واز دو سال بہ اصلاح شعر شہریاری پرداختم" اس کے علاوہ شہزادوں کے زیر اہتمام قلعۂ معلیٰ میں جو مشاعرے ہوا کرتے تھے غالب بھی شرکت کرتے اور فارسی اور کبھی اردو غزل پڑھتے۔ بادشاہ کی تعریف میں تین قطعے، ایک مثنوی، سولہ قصیدے اور چند غزلیں ہیں۔ بادشاہ کی مہم و قصد گری، شہزادوں کی پیدائش، شادی اور موت اور دیگر اہم واقعات کو بھی غالب نے نظم کیا ہے۔

خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام غالب نے جولائی ۱۸۵۰ء عیسوی میں شروع کیا جسکا نام پرستان تجویز ہوا تھا۔ پہلے حصہ میں ابتدا سے ہمایوں کے انتقال تک کے حالات درج ہیں اور یہ حصہ مہر نیم روز کے نام سے موسوم ہوا اور ۱۸۵۲ء عیسوی میں مکمل ہو کر ۱۸۵۴ء عیسوی میں شائع ہوا لیکن دوسرا حصہ بنام ماہ نیم ماہ جس میں اکبر کے عہد حکومت سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے واقعات کو رقم کرنا تجویز ہوا تھا شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا کیوں کہ ۱۸۵۷ء عیسوی میں افراتفری شروع ہو چکی تھی۔ اس ضمن میں غالب لکھتے ہیں:" ماہ نیم ماہ می خوانند آں خود اسمی است کہ مسمیٰ ندارد۔ ہرگاہ یک نیمہ از پرستان انجامید و مہر نیم روز نام یافت"

اپنی فارسی تصنیف دستنبو میں غالب نے مئی ۱۸۵۷ء عیسوی سے جولائی ۱۸۵۸ء عیسوی تک غدر کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس تالیف میں پندرہ مہینے کی روداد ہے جو تباہیٔ شہر اور مصنف کی سرگذشت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب کے نزدیک غدر کسی قومی تحریک کا نتیجہ یا جنگِ آزادی کا مظہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ تھا۔

اس میں ملکہ وکٹوریہ کی شان میں ایک قصیدہ اور ایک قطعہ بھی ہے جو قطعۂ چراغاں کے نام سے مشہور ہے۔

غالبؔ کی ایک اور تالیف پنج آہنگ کے نام سے موسوم ہے جس میں پانچ باب ہیں۔ پہلے باب میں فارسی انشار پردازی پر اظہار خیالات کیا ہے، دوسرے میں فارسی مصادر، محاورات اور الفاظ کی فرہنگ ہے، تیسرے میں شاعر کا انتخاب کلام، چوتھے میں تقریظیں، خطبے اور مضامین اور پانچویں میں متفرق خطوط ہیں۔ یہ ایک عمدہ تصنیف ہے۔

سبد چین میں غالبؔ نے وہ قطعے، قصیدے، غزلیں، مثنویاں اور رباعیاں شامل کی ہیں جو ان کے کلیات نظم فارسی میں شامل نہیں ہیں۔ سبد چین ساڑھے چھ سو شعروں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بارے میں غالبؔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "ہر آئینہ آنچہ پس از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد در اوراق جداگانہ ضبط کردہ شد و آن را سبد چین نام نہادہ ام" سبد چین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ غالبؔ نے جسیات کو اس میں شامل کیا ہے اور اس میں ایک طویل ترکیب بند ہے جس میں غالبؔ نے اپنی قید کی بامشقت زندگی کو بہت ہی دلدوز اور پر اثر انداز میں پیش کیا ہے اور جس کو وہ اپنا شہکار تصور کرتے ہیں۔ ؎

در خرابی بجہان میکدہ بنیاد نہم — در اسیری بہ سخن دعویٔ اعجاز کنم
بی مشقت نبود قید بشعر آویزم — روزکی چند رسن تابیٔ آواز کنم
بہ صریر قلم خویش بود مستیٔ من — اندران بند گران بین وسبکدستیٔ من

اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۷ء عیسوی میں نکلا اور نولکشور پریس لکھنؤ نے ۱۹۲۵ء عیسوی میں اور مکتبہ جامعہ دہلی نے اسے ۱۹۳۸ء عیسوی میں شائع کیا۔

کلیات نظم فارسی جس کا نام بقول قاضی عبدالودود میخانۂ آرزو سر انجام تھا ۱۲۵۱ء ہجری اور ۱۲۵۳ء ہجری مطابق ۱۸۳۵ء عیسوی اور ۱۸۳۸ء عیسوی کے درمیان مرتب ہو چکا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس میں غالب کے قصائد، قطعات، مثنویات، غزلیات، رباعیات اور مخمسات کے علاوہ ترکیب بند و ترجیع بند شامل ہیں۔ غالب کے ایک عزیز نواب ضیاء الدین احمد خاں نے غدر کے بعد اسے بڑی محنت سے جمع کیا اور ان کے صاحب زادے شہاب الدین احمد خاں نے ۱۸۶۱ء عیسوی میں منشی نولکشور کے پاس بھیجا جنہوں نے ۱۸۶۳ء عیسوی میں شائع کیا اگرچہ اس سے قبل ایک ایڈیشن ۱۸۴۵ء عیسوی میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی زیر نگرانی مطبع دارالسلام دہلی سے چھپا تھا لیکن وہ معہ دیگر قلمی نسخوں کے غدر میں ضائع ہوگیا۔ نولکشور ایڈیشن کی تقریظ غالب نے لکھی اور اس سلسلہ میں سید بدرالدین احمد کو لکھتے ہیں: "منشی نولکشور نے شہاب الدین احمد خاں کو لکھ کر کلیاتِ فارسی جو ضیاء الدین احمد خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا وہ منگالیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جز ہیں یعنی کوئی مصرع اس سے خالی نہیں۔" بقول غالب کلیات میں دس ہزار چار سو چوبیس اشعار از قسم مثنوی، غزل، رباعی، قصیدہ، ترکیب بند و ترجیع بند کے ہیں۔ غزل کے اشعار چار ہزار سے زائد اور مثنوی کے لگ بھگ دو ہزار، قطعات کے قریب آٹھ سو اور باقی دیگر اصناف نظم کے اشعار ہیں۔

غزلوں کی تعداد تین سو اٹھائیس ہے، قطعے باسٹھ ہیں جو اکثر ہنگامی حالات سے متعلق ہیں۔ ان میں نوحے بھی شامل ہیں۔ مثنویاں گیارہ ہیں جو موضوعات کے اعتبار سے صوفیانہ بیانیہ، اخلاقی، واقعاتی، مذہبی اور مدحیہ ہیں جن میں سرمۂ بینش (بہادر شاہ ظفر کی مدح میں)، چراغ دیر (بنارس کی تعریف میں)، بادِ مخالف (کلکتہ کے ہنگامہ سے متعلق)، تبرکات اور ابر گہر بار (جو مسئلہ امتناع نظیر ختم المرسلین اور غزواتِ نبوی کے تذکروں کا منظوم مقدمہ ہیں) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ باقی دو ایک قصے، تہنیت نامے اور تقریظیں ہیں۔

مثنوی —— ابر گہر بار سب سے بڑی مگر نا تمام ہے اور یقیناً ایران کی مثنویوں کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم نہیں۔ دعاء الصباح بھی ایک مثنوی ہے جس کو غالب نے اپنے بھانجے کے اصرار پر لکھا تھا دراصل یہ عربی دعاء الصباح کا منظوم ترجمہ ہے جو حضرت علی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے منسوب ہے۔ اس کو منشی نولکشور نے غالب کی زندگی ہی میں شائع کیا۔ یہ سچ ہے کہ غالب نے اپنے فارسی کلام کو اپنا بہترین سرمایہ تصور کیا ہے جس کو انھوں نے اپنی عمر کی اڑتالیسویں سال میں ترتیب دیا۔

گل رعنا میں غالب کے فارسی اور اردو شعر ہیں جسکو مولوی سراج الدین احمد نے آئینۂ سکندری کی ایما پر ترتیب دیا اور باغ دودر کو سبد چین کی اشاعت کے بعد غالب نے اپنی نگرانی نے مرتب کیا۔ اس میں صرف ایک سو چھیالیس اشعار سبد چین کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ باقی اشعار وہی ہیں جو سبد چین میں موجود ہیں۔ یہ تقریباً ۱۸۷۰ء عیسوی میں غالب کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں نکات و رقعات میں فارسی گرامر کی اردو میں مختصراً صراحت ہے اور چند فارسی خطوط ضمیمہ کے طور پر ہیں۔ اردو میں غالب کا دیوان ان کی عظمت کا نشان ہے اور ان کے خطوط کے مجموعے بنام اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے متفرقاتِ غالب کے نام سے ایک مجموعہ ایک نادر قلمی بیاض کی مدد سے تیار کیا ہے۔ اس میں فارسی خطوط ہیں جو غالب نے کلکتہ کے احباب کے نام لکھے ہیں۔ مثنوی بادِ مخالف کے ساتھ ایک اور مثنوی ہے جو غالب نے ۱۸۵۳ء عیسوی میں بہادر شاہ ظفر کی طرف سے تشئیع سے برأت کے لئے لکھی تھی۔ اس میں کچھ نظمیں بھی ہیں ۱۹۴۷ء میں اسے ہندوستان پریس رامپور نے چھاپا۔

غالب کے معاصرین کے مطابق انھوں نے اپنے کلام کا خود ہی انتخاب کیا تھا۔ کسی کی فہمائش یا فرمائش پر نہیں بلکہ اپنے ذوقِ سلیم کی بنا پر ترتیب دیا۔ غالب نے اپنے متداول دیوان کے دیباچوں اور کئی خطوں میں اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ انھوں نے ہی اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیروانی کے پیش نظر اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ انتخاب سوائے غالب کے کوئی اور ترتیب دے ہی نہیں سکتا تھا کیوں کہ انتخاب کے بعض اشعار کی اصلاح کی گئی ہے یا انتخاب میں اصلاح بار بار کی گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درحقیقت غالبؔ کو فارسی سے ذہنی مناسبت تھی اور اس میں ان کا مطالعہ نہ صرف گہرا تھا بلکہ انھیں اس زبان پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ سچ مچ غالبؔ کی فارسی شاعری میں قدیم سرمایہ کا نچوڑ ہے اور حال و مستقبل کے لئے دلبستگی کا پورا سامان موجود ہے یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ جب غالبؔ کی فارسی شاعری کے عروج کا دور تھا اس وقت فارسی زبان جو تقریباً آٹھ سو سال تک ہندوستان میں بحیثیت درباری و ثقافتی زبان کے براجمان تھی، تیزی سے تنزل کی طرف مائل تھی اور سبک ہندی' یعنی اردو زبان ترقی کے منازل طے کر رہی تھی۔ غالبؔ کو اس سے مفر نہیں تھا۔ پچیس سال کی عمر تک اردو میں مشقِ سخن کرتے رہے اور اس طرح اردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچایا اس کے بعد فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور پچیس برس تک یہ سلسلہ پورے انہماک کے ساتھ جاری رہا مگر ۱۸۵۰ء عیسوی میں قلعۂ دہلی سے تعلق قائم ہوا اور بادشاہ اور بادشاہ زادوں کے اردو کلام پر اصلاح دینے کی خدمت سپرد ہوئی اور چارو ناچار اردو کی طرف بھی توجہ کرنا پڑی۔ غالب کہتے ہیں: "ہر چند از دیر باز بہ گفتن ریختہ نمی گرایم و بہ پارسی زبان سخن می سرایم لیکن چوں رضای خاطر حضرت ظلِ الٰہی در آنست کہ ایں گونہ گفتار بدان حضرت فلک رفعت ارمغان می بردہ باشم۔ ناچار گاہ گاہ ریختہ ہمی گویم۔"

اس میں شک نہیں کہ غالبؔ کی فارسی دانی کا زعم ایک افسانوی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ غالبؔ خود کو بالواسطہ فارسی کے اہل زبان میں شمار کرتے تھے اور یہ واسطہ ملا عبدالصمد کی متنازعہ فیہ شاگردی تھی اگرچہ تحقیق سے ثابت ہے کہ ملا عبدالصمد غالبؔ کا 'زائیدہ طبع' اور 'فرضی' نام ہے جس کا کوئی خارجی وجود نہیں لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے میں عبدالصمد غیر معمولی قابلیت و استعداد کا مالک تھا اور سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتہ کا راز اس پر کھل چکا تھا۔ عربی کا بھی اسے گہرا علم تھا اور دو سال کی صحبت میں غالب کی ذکاوت طبع نے اس قدر حاصل کیا کہ مدت العمر کافی رہا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سلسلہ میں غالب ایک خط میں لکھتے ہیں: "میری طبیعت کو فارسی زبان سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابر فارس سے ایک بزرگ اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی معلوم کئے اب مجھ کو اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ دعویٰ اجتہاد نہیں" غالب نے ہرمزد کو ملا عبدالصمد بتلایا ہے جس سے فارسی زبان کے اسرار و رموز ان پر منکشف ہوئے اور درفش کاویانی میں اس طرح وہ رقمطراز ہیں: "مولانا ہرمزد عبدالصمد ایں راز با من گفت۔" اسی کے پیش نظر غالب فرماتے ہیں:

فارسی بین تا بدانی کاندریں اقلیم خیال — مانی و ارژنگم و آں نسخۂ ارتنگِ من است

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ غالب کی فارسی دانی کے زعم نے ایک طرف کلکتہ کے مناقشہ کو جنم دیا تو دوسری جانب قاطع برہان کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ کلکتہ کے کسی ایک جلسے میں غالب نے ایک فارسی غزل پڑھی اس میں ایک لفظ پر بعض اشخاص نے اعتراض کیا اور اعتراض کے جواب میں مرزا قتیل کا قول بطورِ سند پیش کیا۔ غالب چونکہ ہندوستان کے فارسی شاعروں میں امیر خسرو اور کسی حد تک شیخ فیضی کو قابل سند تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا قتیل کی سند کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فرمایا یہ

من کہ طی کردہ ایں مواقف را — چہ شناسم قتیل و واقف را

اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں: "فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھدیا۔ نظامی، سعدی، وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو ہم اسے مانیں۔ ہندیوں کو کیوں مسلم الثبوت جانیں۔" جلسہ میں اکثر قتیل کے شاگرد اور ہمنوا تھے اور ایک جوش و خروش پیدا ہوا۔ غالب کی موقع شناسی نے انھیں مصالحت پر آمادہ کیا اور سلامت روی کا طریقہ اختیار کر کے ایک مثنوی بادِ مخالف کے نام سے لکھی جس میں معرکہ کا سارا ماجرا نظم کیا ہے اور دادِ سخنوری دی ہے۔ اعتراض کو سند سے دفع کیا اور اپنی طرف سے انکسارِ مناسب کے ساتھ معذرت کا حق ادا کیا۔ لیکن جب یہ مثنوی حریفوں کی محفل میں پڑھی گئی تو بجائے اس کے کہ ان کے کمال کو تسلیم کرتے یا مہمان سے اپنی زیادتیوں کا عذر پیش کرتے، ان میں سے ایک نے عمداً کہا کہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مثنوی کا نام کیا ہے؟ معلوم ہوا: بادِ مخالف۔ دوسرے نے گلستان کا فقرہ پڑھا: یکی از صلحا را بادِ مخالف در شکم پیچید، اور سب نے مسکرا دیا۔ علی ہٰذا جب غالب نے قاطع برہان فارسی میں لکھی جس میں برہان قاطع مصنفہ محمد حسین دکنی جیسی مشہور فارسی لغت پر انھوں نے حاشیے لکھے اور غلطیاں بتلائیں جب یہ کتاب ۱۸۶۲ء عیسوی میں شائع ہوئی تو مخالفین کا ایک سیلاب امڈ آیا اور ہر طرف سے جواب لکھے گئے ۱۸۶۶ء عیسوی میں نظرِ ثانی کر کے دوسری مرتبہ شائع کیا اور نام درفش کاویانی رکھا۔ اس کی اشاعت سے علمی دنیا میں پھر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ چونکہ غالب کا لب و لہجہ درشت اور اسلوب سخت تھا اس لئے پرانی طرز کے لوگ بہت چراغ پا ہوگئے اور غالب کے خلاف کئی رسائل مثال کے طور پر ساطع برہان، قاطع القاطع، محرق قاطع، موید برہان اور شمشیر تیز تر اور مختلف خطوط شائع ہوئے۔ غالب نے بھی ان کے جواب اردو میں لکھے یا لکھوائے جن میں تیغ تیز، لطائف غیبی، دافع ہذیان، نامۂ غالب اور سوالات عبدالکریم قابل ذکر ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر قابلِ غور ہے کہ جب مخالفین نے غالب پر سب و شتم شروع کیا۔ حتیٰ کہ گالی گلوچ سے بھی کام لیا تو غالب نے غیض میں آکر اپنے مخالفین میں پٹیالہ اسکول کے ایک مدرس امین الدین پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دیا لیکن موقع شناس غالب نے اپنے دائر کردہ مقدمہ کو راضی نامہ داخل کر کے ختم کر دیا لیکن اپنی شکست کو نہیں مانا۔ ایک مرتبہ اور اسی قبیل کا ایک واقعہ پیش آیا اور وہ اختلاف استادِ شاہ شیخ ابراہیم ذوقؔ سے بروئے کار آیا جب کہ شہزادہ جواں بخت کے سہرے کے مقطع میں غالب نے چیلنج کیا ع دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا۔ بہادر شاہ ظفر یہ سمجھ کر کہ میرے استاد پر تعریض ہے ناگواری محسوس کی۔ لیکن غالب کی موقع شناسی نے فوراً گزارش احوال واقعی، لکھ کر معذرت پیش کی جو یقیناً خلوص پر مبنی تھی۔ بادشاہ نے اس کو منظور کیا۔ اس زمانے کے اخبارات نے بھی غالب کی صلح پسندی اور صاف گوئی کو بہت پسند کیا اور سراہا۔

اگرچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ غالب نے مشق سخن پہلے اردو میں شروع کی اور بعد میں فارسی میں شعر کہنے لگے اور چوں کہ مرزا عبدالقادر بیدلؔ کی وفات اور مرزا غالب کی مشق سخن میں ایک مشکل ایک سو سال کا وقفہ تھا لہٰذا غالب کی شاعری پر بیدل کا اثر انداز ہونا لازمی تھا اور یہ اثر غالب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ابتدائی کلام میں نمایاں ہے جس کا انھوں نے اکثر و بیشتر اعتراف کیا ہے ۔

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے — مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا
مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب — عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا
طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا — اسد اللہ خاں قیامت ہے

اسی طرح غالب نے خدائے سخن میر تقی میر کے صاحبِ کمال ہونے پر نہ صرف ایمان لا- بلکہ ان کے ہر رنگ کو اپنانے کی ہر امکانی کوشش کی ہے ۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں
میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب — جس کا (دیوان) کم از گلشنِ کشمیر نہیں

اس ضمن میں یہ لکھنا نامناسب نہ ہوگا کہ نواب حسام الدین حیدر خاں نے غالب کے کا ہی کرا کے استاد میر تقی میر کو دکھایا۔ میر نے فوراً کہا کہ اگر اس لڑکے کو استاد کامل مل گیا اور اس نے [illegible] کا راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔

اپنے معاصرین کے معاملے میں غالب بڑے وسیع المشرب تھے اور بیشتر شعرائے فارس میں ظہوری، صائب، بیدل، حزیں، نظیری اور عرفی کے کلام سے عقیدت تھی اور ان کے محاسن کا اعتراف اور اظہار کرنے میں پیش پیش رہے ہیں ۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام — خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم
بہ نظم و نثر ظہوری زندہ ام غالب — رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را
ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیرون — با ظہوری و صائب محو ہم زبانی ہاست
ہم چناں آن محیطِ بی ساحل — قلزم فیض میرزا بیدل
غالب مذاق ما نتوان یافتن زما — رو شیوۂ نظیری و طرز حزیں شناس
کیفیت عرفی طلب از طینتِ غالب — جام دگراں بادۂ شیراز ندارد
گفت بہ حکم حسرتی غالب خستہ ایں غزل — شاد بہ ہیچ می شود طبع وفا سرشتہ ما

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او — ننوشت در دیوان غزل تا مصطفٰی خاں خوش نکرد

حتیٰ کہ وہ فارسی اور اردو کے معاصر شعراء جن سے غالب کی یک گونہ حریفانہ چشمک کا احتمال ہو سکتا ہے، اور جن میں سے بعض ان سے نسبت خوردی وشاگردی رکھتے تھے؛ غالب نے واضح طور پر تحسین وتعریف کا اظہار کیا ہے جس سے ان کی عالی ظرفی اور قدر شناسی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود — باد در خلوتِ شاں مشکِ فشاں از دمِ شاں
مومنؔ و نیرؔ و صہبائیؔ و علویؔ آنگاہ — حسرتیؔ، اشرفؔ و آزردہؔ بود اعظمِ شاں
غالبؔ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار — ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدمِ شاں

افسوس کا مقام ہے کہ غالب کے زمانہ میں ان کے فارسی کلام کو شعرائے فارس نے صحیح مقام نہیں ...ان کی شاعری کی قدر نہیں کی گو اس سے انکار نہیں کہ امیر خسرو دہلوی کے بعد اگر کوئی ہندی نژاد ...شاعر ایران کے مشاہیر شعراء کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ مرزا غالب ہیں۔ غالب کو بجا طور ...ایران سے شکایت رہی کہ انھوں نے اپنے اہل زبان ہونے کے زعم میں غالب کے فارسی کلام ...عظمت واہمیت کی قدر نہیں کی اگرچہ انھوں نے اپنے لب ولہجہ کو اہل فارس سے ہم آہنگ کیا ہے۔

ذوقِ فکرِ غالب را بردہ ز انجمن بیروں — با ظہوری و صائب محوِ ہم زبانی ہاست

انھیں اس بات کا بھی ملال تھا کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ایران جانے کی خواہش ...آخری دم تک رہی۔

بود غالب عندلیبی از گلستانِ عجم — من ز غفلت طوطیِ ہندوستاں نامیدمش

اگرچہ ایران کے مشہور شاعر مرزا صائب تبریزی ہندوستان کی علم دوستی اور فارسی نوازی سے متاثر ہو کر فرماتے تھے۔

نیست در ایران زمیں سامانِ تحصیلِ کمال — تا نیامد سوی ہندوستان حنا رنگیں نشد

لیکن غالب کے نزدیک ہندوستان میں کوئی سخن سنج نہیں تھا، کوئی سخن فہم نہیں تھا اور جو تھے میں اتنا بھی شعور نہ تھا کہ وہ پتھر کو گہر سے اور ہتھ نالک کو کرامت سے الگ کر سکتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غالبؔ سخن از ہند برون بر کہ کس ازیں جا — سنگ از گہر و شعبدہ از اعجاز ندانست

فن شعر میں غالبؔ تقلید کے شدت سے منکر ہیں۔ انھوں نے جا بجا اس امر کا اظہار کیا ہے وہ کسی ہم فن پیشرو کے خوشہ چین نہیں ہیں۔ وہ اپنے تئیں اقلیم سخن میں منفرد تصور کرتے ہیں اور سرقہ فکر و شعر کے سخت مخالف ہیں۔ وہ فارسی کی تکمیل اور اس میں عبور حاصل کرنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ طبیعت کی مناسبت کے ساتھ کلامِ اہلِ زبان کا تتبع از حد ضروری و لازمی ہے اور اسی کے پیش نظر ایک قصیدہ میں اپنے اس نظریہ کی صراحت کرتے ہیں ؎

ہرچہ در مبداء فیاض بود آن منست — گل جدا نا شدہ از شاخ بداماں منست

جادۂ عرفی در فتار شفائی دارم — دہلی و آگرہ شیراز و صفاہانِ منست

اور یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنی شاعرانہ صلاحیت کا ازحد احساس ہے ؎

شد آن کہ ہم قدمان را ز من غباری بود — ز رفتگان بگذشتم بہ تیز رفتاری

چہ ننگ اگر بہ سخن ہم فن است چوں بہ سخن — زدودہ ام ز ورق داغ ننگ ہم کاری

رفتہ در حسرتِ نقش قدمی عمر بسر — جادۂ راہ کہ بہ سر منزلِ ما می آید

اور کبھی اپنی شاعری کے اعجاز سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ اسے خدا کی دین تصور کرتے ہیں ؎

غالبؔ قلمت پردہ کشای دم عیسٰی ست — چوں بر روشِ طرزِ خدا داد بجنبد

غالبؔ کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ ان کی طبعِ رسا اور قوت تخیل نے الفاظ کی تہ میں معانی کے ذخائر فراہم کئے ہیں تاکہ لوگ ان سے فیضیاب ہوں ؎

در تہ ہر حرف غالبؔ چیدہ ام میخانۂ — تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

مگر جس آشوب پرور اور ستخیز عنوان زمانے میں غالبؔ نے مشق سخن شروع کی اس کے پیش نظر انھیں اس بات کی توقع نہ تھی کہ ان کے کلام کو قبولیت عام کی سند ملے گی تاہم یہ ان کا ایمان تھا کہ ان کے کلام کی شہرت ان کے بعد ہوگی جیسا کہ وہ فرماتے ہیں ؎

کوکبم در عدم اوج قبولی بودہ است — شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غالب کی یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی اور اس کا ثبوت ان کا صد سالہ جشن جو ہندوستان اور بیرونی ممالک میں ۱۹۶۹ء عیسوی میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔

یہاں یہ لکھنا نامناسب نہ ہوگا کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جو فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے، غالب کو ظہوری اور عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب اور کلیم سے بمراتب بالا و برتر سمجھتے تھے اور نواب ضیاء الدین احمد خاں ان کی فارسی سے متاثر ہو کر ببانگ دہل کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین یعنی امیر خسرو سے ہوئی اور اس کا خاتمہ ایک ترک ایبک یعنی مرزا غالب پر ہوا۔

غالب کی جدت پسند طبیعت سروش غیبی کے مشابہ تھی۔ وہ اپنے لئے نئی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے اور ابتدا میں وہ اپنی خود ساختہ راہوں پر چلے مگر جلد ہی ان کو محسوس ہوا کہ قدیم اساتذۂ فن سے قطع تعلق کر کے وہ منزلِ مقصود سے دور جا پڑیں گے لہٰذا انھوں نے مشاہیر شعرائے فارسی کے کلام کا مطالعہ کیا لیکن کسی کی کورانہ تقلید نہیں کی۔ اگر کسی کی کوئی بات پسند آئی تو اپنی جدت کے کرشمے بھی دکھاتے رہے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ غالب نے اپنی شاعری کو جلا دینے اور فن شعر کو تقویت دینے کی غرض سے شعرائے فارسی کے کلام کا مطالعہ کیا جس کا اعتراف وہ اس طرح کرتے ہیں: "شیخ علی حزیں بخندۂ زیر لبی بی راہ روی ہای مرا در نظرم جلوہ گر ساخت، و زہر نگاہِ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آن ہرزہ جنبشہای ناروا در پای رہ پیمان من بسوخت، ظہوری بسرگرمیٔ گیرائی نفسِ حرزی ببازو و توشۂ بہ کمر بست، و نظیری لاابالی خرام بہ ہنجار خاصہ خودم بجالش آورد، اکنوں بہ یمن فرہ پرورش آموختگیٔ این گروہ کلک رقاص من بخرامش .... تدرواست و برامش موسیقار، بجلوۂ طاؤس است و بہ پرواز عنقا"

غالب کی سلیم الطبعی اور صحیح الخیالی نے فنی اعتبار سے اپنے کلام کو ان تمام بھول بھلیاں سے نکال دیا جس میں متاخرین شعرائے عہد مغلیہ کی شعریت گم ہوگئی تھی اور بالفعل انھوں نے وہ رنگ اختیار کیا جو ان کی شخصیت کا پرتو ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک طرف بیدل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا فلسفہ ہے تو دوسری طرف عرفی کی اپچ ہے، ایک جانب فیضی کا زورِ بیان ہے تو دوسری جانب کا تغزل ہے۔ بالفاظِ دیگر غالب نے غزل میں نظیری اور ظہوری کی روش اختیار کی اور قصیدہ میں عرفی اور انوری کا تتبع کیا ہے لیکن غزل میں سب سے زیادہ متاثر نظیری سے ہیں اور قصیدہ میں عر

غالب میں احساس برتری کا مادہ شدت سے پایا جاتا ہے اور وہ اپنے معاصرین کو اپنا حریف تھے اور کسی سے کم نہیں سمجھتے تھے ع نہ کمترم زحریفان بہ فنِ شعر و سخن، اور یہ گمان کہ ع فیض حق کمینہ شاگردیم، اور اسی بنا پر وہ اپنے قول کو لسان الغیب کا فرمودہ، اور اپنے کلام کو وحیِ الٰہی گردانتے تھے ۔

گر ذوقِ سخن بدہر آئین بودی ۔ دیوان مرا شہرتِ پروین بودی
غالب اگر این فن سخن دین بودی ۔ آں دین را ایزدی کتاب این بودی

اس ضمن میں غالب کے احساس برتری سے متعلق مولانا عبدالباری آسی نے اپنے ایک مضمون بعنو غالب کی شوخیاں میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ غالب خوش فہمی میں مبتلا نظر نہیں آتے ہیں وہ اپنے تئیں دوسروں سے بہتر اور برتر سمجھتے اور اپنی تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ غالب کتب فروش کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ایرانی نوجوان نے دوکان دار سے دریافت کیا غالب داری؟ دوکان دار نے کہا: دیوان غالب ندارم، دیوان ظہوری دارم، دیوان نظیری دارم۔ ا نے کہا۔ ایں ہمہ مطلوب نیست۔ دیوان غالب داری؟ آن قرم بساق خوب می گوید۔ دوکان دار کہا: دیوانِ غالب ندارم، غالب دارم۔ جب اس نے سنا کہ غالب دارم اور غالب کو دیکھا تو بہت شر ہوا۔ غالب نے ہنس کر گلے لگایا اور کہا کہ واللہ ساری عمر میں سچی داد آج ملی ہے۔ اگرچہ اس وا حقیقت ایک لطیفہ سے زیادہ نہیں تاہم غالب کے اشعار ان کے اس احساس کے گواہ ناطق ہے وہ خود کو عدیم المثال بلکہ یکتائے زمانہ تصور کرتے تھے ۔

دانی کہ در سخن بہ کہ مانم ز من مپرس ۔ این دعویٰ مجال کجا کرد روزگار
آنم کہ بہر صنیت صفاتِ کمالِ من ۔ ایجاد و حرف و صوت و عدا کرد روزگار
من خود عدیل خویشتم و نبود عدیل من ۔ چون خود مرا بعصہ فنا کرد روزگار

© rasailojaraid.com